ڈاکٹر سید عبداللہؒ

کمالات فائقہ کا پیکر

شخصیتیں توفیقات ایزدی سے پیدا ہوتی ہیں۔ انکا وجود جو قدرت کے معمولی قوانین کا کرشمہ نہیں ہوتا۔ وہ تو قدرت کے کسی غیر معمولی اور پراسرار عمل سے ظہور میں آتی ہیں۔ یوں قدرت (نیچر) کی اپنی عام کارفرمائی بھی بوقلموں کی گل کاریاں کرتی رہتی ہے اوراس کے ہاتھ کی ہمزوری کے عام عجوبے بھی کچھ کم نہیں۔ صرف پھولوں کی کائنات پر ہی غور کر لیجئے۔ آپ قلمرو گل کی وسعتوں کو دیکھ دیکھ کر محو حیرت تو لازماً ہوں گے مگر آپ بالیقین اس کی پنہائیوں، اس کی رنگا رنگیوں، کرشمہ آفرینیوں اور دلفریبیوں کے انداز ہائے بے شمار کو دیکھ کر تھک بھی تو جائیں گے اور بالآخر کہہ اٹھیں گے۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے!
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے

یہ تو ہوا حال نیچر کی عام تخلیقات کا۔ اور اس کے ادراک کی کوشش کچھ کامیاب بھی ہے۔ مگر نیچر کی تخلیقات فائقہ کی کائنات کے عظیم انسان بھی اسی کا ایک حصہ ہیں۔ خدائے مصور الاجسام والارواح کا ایک بھید ہے۔ یعنی ایک جہان راز جس کا مرکز خود خدا کی ذات مجرد ہی ہے۔ جس کے انعکاسات عظیم فائق انسانوں کا روپ دھارتے رہتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق میر تقی نے سادہ سے الفاظ میں پتے کی بات یوں بتا دی تھی۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اور جب بھی میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ذکر سنتا ہوں اور ان کے کمالات فائقہ کا تصور کرتا ہوں تو میر تقی کا مندرجہ بالا شعر فوراً میری زبان پر وارد ہو جاتا ہے۔

اللهم اغفره وارحمة!

بخاری واقعی ان عظیم اشخاص میں سے تھے جن کی ہستی کی ترکیب و تعمیر میں قدرت کے غیر معمولی قوانین نے کارفرمائی کی۔ اور اگر اس ترکیب و تعمیر میں آسمان، زمان اور وقت کے تصرفات کا واقعی کچھ حصہ ہے تو یقیناً یہ آسمان کی مدتوں کی محنت نے ان کے کمال معنوی کی عمارت تیار کی ہو گی۔

میں شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ سے براہ راست کم ملا ہوں مگر قریب سے دیکھنے کے لئے بے شمار مواقع فراہم ہوئے ہیں اور ان کی تقریریں تو بلا مبالغہ سوڈیڑھ سو مرتبہ سنی ہوں گی۔ جن میں وہ تقریریں بھی شامل ہیں جو مجمع عام کے لئے تھیں اور وہ بھی ہیں جن میں عالمانہ بحث و نظر کی ضرورت ہوتی تھی۔

شاہ جی مرحوم کو قریب سے دیکھنے کی صورت یہ تھی کہ میں مرحوم چودھری افضل حق کے نیازمندان

خاص میں شامل تھا۔ وہ بعض اوقات بغرض مشاورت میرے مکان پر تشریف بھی لے آتے تھے۔ اسی طرح دوسرے احرار اور حریت پسند رہنماؤں سے بھی میری اچھی علیک سلیک تھی۔ ان وجوہ سے دفتر احرار میں میرا آنا جانا تھا اور یہ بات اس زمانے کے احباب کو اچھی طرح معلوم ہے۔

اس طرح گویا میں مجلس احرار کا ایک بے قاعدہ رکن تھا۔ مگر سب کو یہ معلوم تھا کہ میری سرگرمیاں زیادہ تر ادبی ہیں۔ اور سیاسی بھی اگر تھیں تو احرار کی جزئیاتی اور وقتی سیاست سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ مجھے تو ان کے نصب العین اور برطانوی استعمار کے متعلق جرأت مندانہ خیالات سے دلچسپی تھی!

غرض حلقہ احرار کے قرب کا مجھے موقع حاصل تھا اور میں سبھی احرار لیڈروں سے شیر و شکر تھا۔ ماسوا مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے کہ میں ان کے رعب و جلال اور ان کے حد درجہ کھلے انداز بلاغت کی وجہ سے اپنے اندر کچھ ایسی کمی پاتا تھا۔ کہ جس کا احساس مجھے ان کے قریب نہ ہونے دیتا تھا۔ لہذا میں برسوں شاہ جی کو قریب سے مگر دور سے دیکھتا رہا اور خوب دیکھتا رہا۔

ہر حقیقت کو بانداز تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا

میں نے احرار کی مشاورتوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو حکمرانی کرتے دیکھا۔ احرار میں بڑے بڑے مفکر اور حاکم اور مقرر تھے۔ اور انہیں میں چودھری افضل حق بھی تھے۔ مگر شاہ جی اس قبیلے کے وہ سردار تھے جن کی بات کو ٹال مٹول کر دینا کسی کے لئے ناممکن تھا یہ اور بات ہے کہ شاہ جی کی رواداری اور حوصلہ مندی اکثر اس بات کو روا رکھتی تھی کہ مخلص رفقاء کے استدلال کو بھی سن لیتے تھے۔ اور بسا اوقات وہ اپنے رفیقوں کے خلوص سے متاثر ہو کر اپنی رائے ترک بھی کر دیتے تھے۔ مگر پھر بھی میرے اپنے خیال میں مجلس احرار کی سیاسیات کی باگ مسلسل بیس سال تک شاہ جی کے ہاتھ میں رہی۔

شاہ جی کو اپنی جماعت میں یہ مقام کسی چیرہ دستی یا دراز دستی کی وجہ سے حاصل نہ تھا۔ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ شاہ جی سیاسی لیڈر ہو کر بھی سیاست کے طریقے سے نہیں چلتے تھے۔ بلکہ انکی آراء کی بنیاد سیاست کے بجائے صحیح اور مرکزی اساسی عقائد پر تھی۔ میں نے بارہا مجلسوں میں شاہ جی کو مرکزی عقائد پر اڑے دیکھا اور اسی خلوص و عقائد کی بناء پر وہ اکثر اپنے نکتۂ نظر کے منوانے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ اگرچہ (جیسے میں نے پہلے عرض کیا) کبھی کبھی وہ بھی احباب کے خلوص کے سامنے ہتھیار ڈال دیا کرتے تھے۔

اگرچہ مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں جماعت احرار کی اندرونی کاروائیوں کے متعلق کچھ لکھوں خصوصاً جبکہ میرا اس جماعت سے کوئی باقاعدہ تعلق نہ تھا اور میں قلبی طور پر ان کا ہمنوا ہونے کے باوجود "حلقہ بیرونِ در" ہی تھا۔ تاہم زمانہ گزر جانے کے بعد راز کی بات بھی راز کی بات نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے میں عرض کرتا ہوں کہ شاہ جی دو مرتبہ اپنے رفقاء کے خلوص کے سامنے جھکے اور اپنی رائے کو قربان کر دیا۔ پہلا بڑا مرحلہ وہ تھا جس کا تعلق کانگریس کے انقطاع سے تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ شاہ جی اس اقدام سے متفق نہ تھے کیونکہ ان کا

خیال یہ تھا کہ وقتی سیاست کو انگریزی استعمار کے خلاف جہاد کے اُصولی اور مرکزی سوال پر تقدم حاصل نہ ہونا چاہیئے۔ فرقہ وار امور کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے مگر یہی فرقہ وار امور اصولی سوال کے سامنے رکاوٹ بھی بن جاتے ہیں۔ احرار کی یہ بحثیں دو تین مہینے تک جاری رہیں جن میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور حضرت شاہ جی الگ رائے پر تھے۔ مگر افضل حق مرحوم کی ملائمت، نرمی، طریق استدلال، تحمل اور وقتی سیاسی جزیات کا علم آخر بخاری کو قائل کر کے رہا۔ مگر درحقیقت بخاری قائل ہوئے نہیں انہوں نے قربانی کی۔ اور بیس تیس برس گزر جانے کے بعد اب شاید بہت سے لوگوں کو یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ احرار کی وقتی سیاست نے بالآخر انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچایا۔ مسلمان قوم کا پلیٹ فارم تو بہرحال مسلم لیگ کے پاس رہا اور احراری سیاست پر وقت پرستی کا الزام لگا رہا۔

دوسرا نازک موقعہ مسجد شہید گنج کے حوادث کی صورت میں سامنے آیا۔ یہاں بھی میری معلومات کے مطابق شاہ جی کی نظر مسجد کی تقدیس پر تھی اور دوسرے رفقاء (بڑی حد تک بجا طور پر) اس کو سازش سمجھتے تھے (اور وہ سازش تھی بھی) مگر شاہ جی کا قلب سیاسی موقعہ شناسی یا مصلحت کوشی کو برداشت کر ہی نہ سکتا تھا۔ ان کی نظر بنیادی اور مرکزی عقائد میں پیوست رہتی تھی۔ اور میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مرکزی عقائد سے ہٹ کر مجلس احرار نے بالآخر نقصان اٹھایا۔

پھر بھی شاہ جی بالعموم مجلس احرار میں اپنی اس راست روی اور مرکزیت کی وجہ سے بہت جلد غالب رائے کو اپنے حق میں ہموار کر لیتے تھے اور سب رفقاء کو معلوم ہے کہ احرار کی اصلی قوت شاہ جی ہی تھے۔

اس مختصر مضمون میں شاہ جی کے کمالات معنوی کے متعلق تفصیل سے لکھ نہیں سکتا۔ اور شاید اس موضوع پر لکھنے کے لئے ان کے قریبی احباب کا مجھ سے زیادہ حق ہے۔ تاہم ان کی گفتگو اور تقریر کے متعلق چند اشارات کرنے کی گنجائش پاتا ہوں۔

عام خیال کے مطابق شاہ جی کا سب سے بڑا کمال ان کی خطیبانہ ساحری میں مضمر تھا۔ (اور یہ غلط بھی نہیں) میں سمجھتا ہوں کہ شاہ جی کی مجلسی گفتگو بھی ان کی خطابت کے برابر برابر جادو جگاتی تھی۔ اور جمہوریت سے قطع نظر، طبقہ علماء و زعما میں وہ اپنے انداز گفتگو کی وجہ سے ہی ایک فائق مقام کے مالک بنے ہوئے تھے۔

شاہ جی کی گفتگو ہر مجلس اور ہر مقام کے مطابق ہوتی تھی چنانچہ علماء کی محفل میں کتاب و سنت کے موضوعات پر جب وہ بات کرتے تھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص شب و روز کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا ہے۔ بڑے بڑے عالم ان کے سامنے دم بخود بیٹھے رہتے تھے۔ اس طرح اہل ادب کی محفل میں ان کی باتوں پر ادبی لطائف کا کچھ ایسا تسلسل ہوتا تھا کہ مخاطب اپنے آپ کو زعفران زار کے ماحول میں پاتا تھا۔ برجستہ عربی، فارسی، اردو، پنجابی کے اشعار ان کی گفتگو میں مناسب مقام پر خود بخود آپہنچتے تھے اور جب سیاستدانوں کی مجلس میں ہوتے تو ان کی سیاسی معلومات کا بھی گہرا نقش بیٹھتا تھا۔ اگرچہ وہ سب سے زیادہ اسی جماعت سے متوحش ہوتے تھے۔ خصوصاً اس زمانے کے مسلمان سیاستدانوں کی صحبت میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ ان بدبختوں کے دل پر خدا کے سوا ہر شے کا خوف غالب ہے۔

غرض شاہ جی ہر مجلس میں مناسب موقعہ نہایت بلیغ گفتگو کیا کرتے تھے اور اس کا بڑا اثر ہوتا تھا۔ مگر شاہ جی کی گفتگو میں بلاغت کا سب سے بڑا پہلو ان کی حاضر جوابی بذلہ سنجی اور طنز کا کٹیلا پن تھا۔ اور ان کا یہ وہ ہتھیار تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ اور وہ اپنے خداداد ملکے کی بدولت ہر مجلس میں شریک غالب بھی ہوتے تھے اور راحت محفل بھی۔ مرحوم افضل حق کی یہ حالت تھی کہ سید صاحب جس طویل دورے پر باہر چلے جاتے تو فرمایا کرتے:۔

"شاہ جی دے بغیر مارٹیاں کھولے (کھنڈر) معلوم ہوندے نیں"

اور کبھی کبھی کوئی صورت پیدا کر کے ان کا دورہ کٹوا بھی دیتے اور پھر اپنی محبت آمیز شرارت پر بہت خوش ہوتے۔

مختصر یہ کہ شاہ جی کو گفتگو کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا اور ان کے قبول عام میں اس چیز کا بھی بڑا حصہ تھا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ شاہ جی کا سب سے بڑا کمال ان کا خطیبانہ انداز تقریر تھا۔ جس سے وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کے مجمع کو کئی کئی گھنٹوں تک مسحور کئے رکھتے تھے۔ شاید پچھلی دو تین صدیوں میں ان سے بڑا شیوا بیان خطیب کوئی ظہور میں نہیں آیا ہو گا۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو واضح اور مسلّم ہونے کی وجہ سے محتاج ثبوت نہیں۔ شاہ جی کی خطابت کے خصائص کا ادبی و فنی تجزیہ اگر کیا جائے تو لامحالہ ان کی ORATORY کو دنیا کے بڑے بڑے آریٹرز کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھنا ہو گا۔ یونانیوں اور رومنوں کی خطابت کا فن اپنے اسلوب کے اعتبار سے دو مختلف لہروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یونانی خطابت اپنے کمال کے لئے ایسی شخصیتوں کی طلب گار تھی جس کا سب سے بڑا جوہر دانش ہوتا تھا۔ رومنوں کی خطابت اپنی بلوغ کے لئے ایسے وجود کی طلب گار تھی جس کا سب سے بڑا جوہر تدبر اور رعب سلطنت داری تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خطابت کا ایک اہم پہلو مخاطبوں کے جذبات اور تعصبات کا ادراک اور شعور ہوتا ہے مگر خطابت ہر قوم اور ہر ملک کے مطابق جدا جدا خصوصیات بھی رکھتی ہے۔ مثلاً انگریزوں کی خطابت میں سب سے زیادہ اپیل کرنے والی چیز جمہوری احساس اور معاشرے کی مادی بہبود اور اس سے مطابقت رکھنے والا جذبات آمیز عقلی استدلال ہوتا ہے۔ قدیم عربوں کی خطابت میں بدویانہ آزادی قبیلے کا فخر و غرور جس کو شاعرانہ نثر یا اجزاء میں ڈھال کر پیش کرنا ہی سب سے بڑا کمال تھا۔

افسوس ہے کہ مسلمانان ہندوستان کی خطابت کی کوئی تاریخ موجود نہیں تاہم تاریخوں میں کچھ کچھ اشارے ضرور مل جاتے ہیں لیکن اکثر اس کا ذکر ذاکرین اور واعظین کی فہرستوں میں پایا جاتا ہے مغلوں سے پہلے کے چند بڑے آدمی فخر مدبر اور ابواب الجنان کے مصنف ملا قزوینی وغیرہ کی خطابت کی کچھ روداد مرتب ہو سکتی ہے۔

آخری دور مغلیہ میں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے اور ولی اللّٰہی تحریک میں شاہ اسمٰعیل شہید وغیرہ نے بڑا نام پیدا کیا۔ یوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالرحیم بھی اچھے مقرر تھے۔ اور ہمارے زمانے میں سابقاً مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی اور بعد میں بہت ہی ممتاز نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ یہ نامکمل

فہرست خطیب علماء کی ہے اس میں مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کو شامل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ان لوگوں کی خطابت کا رنگ جدا ہے۔

حضرت شاہ جی مرحوم کی خطابت دراصل ایک قدیم عظیم روایت سے تعلق رکھتی ہے۔ شاہ جی سے پہلے قریبی زمانہ میں نامور ترین بزرگ "مولانا اشرف علی" تھانوی تھے شاہ جی کی خطابت کا تعلق ایک خاص حد تک انہی سے قائم کیا جاسکتا ہے

حضرت تھانوی کی خطابت کا اہم خاصہ وقت کی طوالت اور اس کے باوجود دلچسپی کا قائم رکھنا تھا۔ حضرت شاہ جی کے یہاں بھی یہی خصوصیت کار فرما تھی اور اگرچہ حضرت تھانوی کی تقریر میں بھی ادب شعر اور بذلہ وظرافت کا ایک خاص رنگ تھا مگر آواز کی گرج اور شخصیت کا جو جلال حضرت شاہ جی کو میسر آیا وہ انہی سے مخصوص تھا۔ اس کے علاوہ حضرت تھانوی کے موضوعات عموماً ٹھنڈے ٹھنڈے ہوتے تھے۔ ان میں کہانی کا سا لطف ہوتا تھا۔ مگر حضرت شاہ جی کی تقریروں کا موضوع جوش انگیز ہوتا تھا۔ اور اس میں رجز کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

اسی لئے میں حضرت تھانوی کو واعظ کہوں گا۔ اور حضرت شاہ جی کو کامیاب بلکہ غیر معمولی خطیب قرار دوں گا۔ حضرت تھانوی کی تقریر صرف ان کے معتقد سنتے تھے مگر شاہ جی کو ایسے اجتماعات سے واسطہ پڑتا تھا جس میں اختلاف رکھنے والوں کی موجودگی ایک یقینی بات تھی۔ اس لئے شاہ جی کی خطابت کو زیادہ سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

یہ تفصیل میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ ہر چند کہ حضرت شاہ جی ہندوستان کی ایک قدیم روایت خطابت کے وارث تھے مگر دراصل ان کی خطابت ادوار اور قرنوں کی حدوں سے بلند تر اور ارفع تر تھی۔ اور اس میں تاثیر تفریح اور تلقین کی ایسی صورتیں موجود تھیں جن کے لئے صرف حضرت شاہ جی کی شخصیت کو قدرت نے موزوں سمجھ کر منتخب کیا تھا اور بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاہ جی کی خطابت کے سب عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی خطابت کو انگریزی خطابت سے کوئی قریبی تعلق نہ تھا اس معاملے میں انہی کے زمانے میں ایک دوسرا یکتا خطیب ابوالکلام آزاد حضرت شاہ جی کے مقابلہ میں ارفع کمالات کا مالک نظر آتا ہے کیونکہ اس کی تقریر میں دانش، رعب داب، عربی حریت اور فرانسیسی انگریزی انداز استدلال کے سب عناصر جمع ہوتے تھے۔

حاصل کلام، یہ تھے حضرت شاہ جی جن کی شخصیت اور کمال کے چند نمایاں نقوش میں نے یہاں مرتب کر دیئے ہیں۔